منشا یاد کے افسانوں میں سماجی و معاشرتی مسائل کی عکاسی

ڈاکٹر صنم شاکر [1]، ڈاکٹر محمد وسیم انجم **

Abstract:

"Mansha Yaad is one of the famous short story writer in Pakistan. He highlighted the core issues of Pakistani society in his stories. He wrote on the rural issues and on the lack of facilities in rural area as well he also wrote on the city life and on the darker sides under the lights. Mansha yaad proofs himself through his style and the selection of the topics. He belongs to a village situated in Punjab is one of the reason that he portrayed beautifully the social issues of the rural life in his short stories. He wrote on lot of social issues such as politics, literature, religion, urban and rural problems, poverty, and on many more. His style of writing is so unique as the critic of the Urdu literature like his way of writing."

ادب کو زندگی کا مفسر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ زندگی کے تمام علوم کسی ایک جہت یا پہلو کا احاطہ کرتے ہیں۔ مگر ادب میں زندگی کے تمام پہلو غرض سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور تاریخی دھارے آ کر سمٹ جاتے ہیں۔ منشا یاد بحیثیت افسانہ نگار پریم چند کی روایت کے امین ہیں۔ وہ اپنے سماج، ماحول اور تمدنی فضا سے متاثر ہیں۔ انھوں نے اپنے سماجی حالات سے بصیرت حاصل کی۔ اور ہم عصر اقدارو روایات کا جائزہ لے کر فکری رجحان کا ساتھ دیا۔ منشا یاد کا سماجی شعور اپنے سماج کی تہذیب و ثقافت میں پیوست ہے۔ کیونکہ وہ عصری مسائل کا ادراک رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی مسائل، معاشرتی ناہمواری، جبرواستحصال، بے چینی اور انسانی کرب کو موضوع بنایا۔

۱۹۳۰ء کے بعد جب اُردو افسانہ ترقی پسندی کے تحت لکھا جانے لگا تو لکھاریوں نے معاشرتی وسماجی مسائل مستقل طور پر افسانے میں پیش کیے اور معاشرے کی بے راہ روی، جبرو تشدد، حکمرانوں کے جبر، بے انصافی، غربت اور کسان و مزدور کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھائی اور افسانے کا موضوع بنایا۔ یوں معاشرے کے تمام مسائل کو افسانہ نگاروں کے ذریعے پیش کیا جانے لگا۔ چناچہ افسانہ سماجی مسائل کی عکاسی کرنے والی صنف کے طور پر جانا جانے لگا۔ یہ سلسلہ آج بھی افسانہ نگاری میں حاوی ہے۔

باوجود اس کے کہ منشا یاد کے افسانے کا دور پاکستانی تاریخ سے منسلک ہے۔ جب نئے تصورات جدید طرز پر آگے بڑھ رہے تھے منشا یاد نے بھی اپنے معاصرین کی طرح اُردو افسانے کی فضا کو متحرک اور رواں رکھا جس کی بنیاد پر وہ عہد ساز افسانہ نگار کہلائے۔ ان کی کہانیاں معاشرے کے ساتھ پیوست ہیں اور گہرا معاشرتی ادراک لیے ہوئے ہیں۔ منشا یاد نے فکری اور اسلوبیاتی جدت پسندی سے افسانہ نگاری کو عروج بخشا۔ اس لیے کہ اُن کی فکر اپنے معاشرے سے جُڑی ہوئی ہے۔ منشا یاد کے ہاں موضوعات روائتی بھی ہیں اور جدید بھی۔ انھوں نے زندگی کی سہل علامتوں کو اپنے اظہار کا یوں ذریعہ بنایا جس میں شہری اور دیہی زندگی کا مربوط آہنگ اور رنگ نمایاں ہو۔

منشا یاد جدید عہد کا افسانہ نگار ہے لیکن اُن کی فکر کا رابطہ پُرانی روایات سے اتنا گہرا ہے کہ گزشتہ ادوار واضح طور پر جدید دور میں سمٹ آئے ہیں۔ چنانچہ اُن کی کہانیوں میں روائیتی کہانی

---

[1] وزیٹنگ پروفیسر، شعبہ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد
** صدر شعبہ اردو ،وفاقی اردو یونیورسٹی ،اسلام آباد

اور جدید عصر کا دُکھ مل کر ایک منفرد اسلوب بنتا محسوس ہوتا ہے۔ روایات سے جدید اسلوب تک اُن کی کہانیوں میں تاریخی شعورپایا جاتا ہے۔ جس میں کہیں نفسی دوربینی اور کہیں حقائق بینی کی سطح نمایاں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ فکری تہہ داری اور گہری معنویت کو اُبھارنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ علامتیت اور رمزیت کے فنکارانہ عمل نے گہری معنویت پیدا کر دی ہے۔ منشا یاد کے افسانوں میں ذات کے جبر، معاشرے اور ماحول کے جبر اور تقدیر ووقت کے جبر کی مختلف صورتوں کی بھی عکاسی ہے۔ خارج اور باطن کے تال میل سے وہ انسان کی ازلی وابدی بے بسی، مجبوری و لاچاری کے تصور کو نمایاں کرتے اور سیاسی وطبقاتی جبریت کی بدولت بے بسی کی مختلف تہوں کی نقاب کشائی نے ہمہ گیریت پیدا کر دی ہے۔

منشا یاد نے اپنی کہانیوں میں کسانوں، پسے ہوئے اور متوسط طبقوں میں پائے جانے والی سیاسی وسماجی گھٹن اور دیہی زندگی کی مفلوج صورت حال کی عکاسی بھرپور انداز سے کی۔ اُن کے نزدیک دیہات میں زندگی بسر کرنے والے وہ غریب مزارعے، کسان یا کمی کمین جو چودھریوں اور جاگیرداروں کے ظلم کا شکار بنتے ہیں اور کسمپرسی کے بموجب اپنے حقوق کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ دبی ہوئی انہیں آوازوں کو اپنی کہانیوں میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ منشا یاد نے کبھی دیہات کے پیچیدہ مسائل اور سہولیات کے فقدان کا تذکرہ کیا تو کبھی شہر کے قمقموں کی روشنی میں چھپے اندھیرے کو موضوع بنایا۔ سماج کی انتہائی سفاکی کو نہایت چابکدستی اور وضاحت سے پیش کرنا اُن کے فن کا حصہ رہا ہے۔

''دل کا بوجھ'' افسانہ معاشرتی مسائل سے گھرے ہوئے متوسط طبقے کے ایسے فرد کی کہانی ہے جسے مکان کی تعمیر کے دوران ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے جو سیمنٹ، سریا، بجری چوری کر کے لے جاتے ہیں۔ پھر ایسے میں گُل باز ایک ایمان دار چوکیدار مل جاتا ہے جو ایک کی بجائے دو تین مزدوروں کا کام سنبھال لیتا ہے۔ مالک مکان کو اس کی خدمات کا احساس تو ہوتا ہے۔ لیکن خودغرضی اُمنڈ آتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ گُل باز کی حق تلفی نہ کرے۔ اس کو زائد تنخواہ دے کر اپنے ضمیر کا بوجھ بھی ہلکا کرے لیکن ٹال مٹول سے کام لیتا ہے۔ مکان کی تعمیر مکمل ہو جاتی ہے۔ گُل باز بھی کسی دوسری جگہ چلا جاتا ہے۔ ایسے میں ضمیر کی خلش مالکِ مکان کو بے چین کرتی ہے۔ جس کا اظہار وہ یوں کرتا ہے۔

> '' ہم کرائے کے مکان سے اُٹھ کر اپنے نئے مکان میں آ گئے اور وہ کسی جھونپڑی میں منتقل ہو گیا۔ میں نے اس کی تنخواہ کی پائی پائی ادا کر دی۔ لیکن میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا کہ میں نے اس کی محنت کا کم از کم دو تہائی حصہ غصب کر لیا ہے۔ اور اس طرح میں نے روائیتی بورژوائیت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک محنت کش کا استحصال کیا ہے۔'' (۱)

''جڑیں'' افسانہ ایک ایسے سادہ لوح دیہاتی لڑکے کی سرگزشت ہے جو اپنی روایات سے ہمیشہ جڑا رہنا چاہتا ہے۔ لیکن جب دیہات سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے شہر آتا ہے تو یہاں کے بگڑے ہوئے نوجوان اس کی تعلیم میں مخل ہوتے ہیں۔ اسے زبردستی شراب پلاتے اور تھیٹر لے جاتے۔ تھیٹر کا ناسازگار ماحول، چرس کی بو سگریٹوں کا دھواں اسے انتہائی ناگوار گزرتا ہے۔ یہ مرکزی کردار جب اسٹیج پر نوخیز لڑکیوں کو رقص و سرور میں دیکھتا ہے تو اسے ان میں کبھی اپنی بہن کی ہم جماعت تو کبھی اپنی ماموں زاد بہن نظر آتی ہے۔ یوں منشا یاد کرداروں کے ذریعے ناشائستگی کی یوں عکاسی کرتا ہے کہ قاری کا ذہن اخلاقی، تہذیبی شعور کی طرف راغب ہونے لگتا ہے۔

افسانہ ''کالک'' میں معاشرے کی منافقت وریا کاری اور خراب چال چلن کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کہ کس طرح دورِجدید کے معاشرے میں پھیلی افراتفری اور خود غرضی انسانی قدروں کو پامال کرتی ہے۔

> ''میں آہیں بھی بھرتا ہوں ہمدردی بھی محسوس کرتا ہوں اور مرنے والےکے لواحقین پرترس بھی آتا ہے اور اس نہ رو سکنے کی وجہ آہستہ آہستہ میرے اندر کے جوہڑ میں مری ہوئی مچھلیوں کی

بو اور زیادہ پھیلتی جا رہی ہے۔'' (۲)

کہانی کا مرکزی کردار اندرونی کرب و بے چینی کا شکار ہے۔ جو دھاڑیں مار مار کر روتا ہے۔ جواس کے اندر کی آواز ہے اور اسے بے چین کیے رکھتی ہے۔ یہ افسانہ اندرونی کشمکش کا غماز ہے۔ جبکہ متوسط طبقے کی ناآسودہ خواہشات بھی اس افسانے میں نظر آتی ہے۔

افسانہ ''چھتیں اور ستون''میں سرمایہ دار طبقے کی مفاد پرستی کو پیش کیا گیا ہے۔ سامراجی نظام کے خلاف منفرد انداز سے آواز اُٹھانے کا بہترین نمونہ ہے۔ جسے افسانہ نگار نے یوں واضح کیا:

''دوسری شفٹ کی لیبر اب تھک کر چور ہو چکی تھی مگر ٹھیکے دار اور اس کےمیٹ منشی چلا چلا کر ان کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ 'شاباش پترو۔۔۔شاباش پترو'۔وہ نعرے لگا کر ان کے تھکے ہوئے جسموں سے خون کی آخری بوندیں بھی نچوڑلینا چاہتے تھے۔'' (۳)

''دو جمع دو، اور خواہش کا اندھا کنواں'' افسانے میں تقسیم کا رجحان غالب ہے۔ جس میں ایک محروم یا تیسرے درجے کا شخص امیروں سے خار کھاتا ہے۔ طبقاتی شعور کا یہ غلبہ انسانوں کی نفسیات میں کیسے کیسے مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی نشاندہی یوں کی ہے۔

''بڑے کوارٹروں میں کمرے خالی پڑے رہتے ہیں اور چھوٹے کوارٹروں میں مکینوں کو چارپائیاں گلیوں میں بچھانا پڑتی ہیں۔'' (۴)

دونوں افسانوں کے مرکزی کردار کی زبانی امیر و غریب کی طبقاتی کشمکش کو اُجاگر کرنے کی کوشش ہے۔ کہیں جگہ جگہ انسانی لاشوں کے ڈھیر تو کہیں آسائش ولطافت کا بحرِبے کراں اس کی اصل وجہ ہمارا حکمران طبقہ ہے۔ جو خود تو آرام طلب ہے لیکن غریبوں کو چین سے رہنے نہیں دیتا۔ اُن کے خلاف بات کرنے پر زبانوں میں سوراخ کر دیئے جاتے اور منہ میں لوہے کی گرم سلاخیں ٹھونکیں جاتی تھیں۔ یہ تاریخی شعور ہے جو افسانہ نگار میں پایا جاتا ہے۔ مذکورہ افسانہ معنی خیز انجام پر ختم ہوتا ہے۔

'' راستے بند ہیں'' میں بھوک اور افلاس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں بھوک اور افلاس زدہ شخص کو پیش کیا گیا ہے۔ اُس میں پھل خریدنے کی استطاعت نہیں۔ چنانچہ وہ سیب کے ذائقے کو خیالی طور پر محسوس کرتا ہے۔ ذائقوں کے گڈ مڈ ہونے کی یہ علامت ہمارے غربت زدہ معاشرے کی کہانی ہے۔ بنیادی طور پر احساس محرومی کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں قاری فکر انگیز زور دار جملوں کو محسوس کرتا ہوا صورتحال کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ ''راستے بند ہیں'' میں دنیاوی میلے کا بیان ہے یہ چار دن کا میلہ دراصل یہ میلہ زندگی کا ہے جسے منشا یاد نے استعارے کے طور پر لیا ہے۔

منشا یاد کے افسانے قاری کے ذہن کو اُسی سمت کی طرف لے جاتے ہیں۔ جدھر افسانہ نگار لے جانا چاہتا ہے۔ اُن کی کہانیاں حواسِ خمسہ پر چھا جاتی ہیں۔ سوچ کو ترغیب ملتی ہے کہ منشا یاد کی نظر کس طرح چھوٹے چھوٹے مگر اہم مسائل کو اپنی گرفت میں لیتی ہے۔

''کچی پکی قبریں'' کا کوڈو فقیر بھی معاشرتی جبرواستحصال کا شکار ہے۔ وہ گاؤں کے قبرستان میں اپنی جھونپڑی میں اکیلا رہتا ہے۔ سماجی نا انصافیوں کا مارا ہوا ایک لنگڑا فقیر ہے۔ گاؤں میں بھیک مانگنے کے دوران اس کا سامنا چودھری بخشے کی بیٹی نوراں سے ہوتا ہے۔ اس کے دل میں نوراں کے لیے عشق کے جذبات اُبھرتے ہیں ۔ البتہ اسے اپنی حیثیت کا علم بھی ہے کہ وہ ایک حقیر فقیر ہے جس کے میلے بدن پر ہر وقت مکھیاں بھنبھناتی ہیں اور عشق کے جس راستے پر وہ اپنے دل کی آواز سن کر چل نکلا ہے۔ وہ ظالموں کا راستہ ہے جہاں آئے روز ظلم کی تلوار کھنکھناتی ہے لیکن وہ بھی تو ایک انسان ہے۔ وہ فقیر خود نہیں بنا بلکہ حالات کے جبر نے بنایا ہے۔ منشا یاد نے ایسے کردار منتخب کر کے معاشرے میں پائی جانے والی سماجی ومعاشی ناانصافی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

'' اندھیری راتوں میں قبرستان میں خاموشی چھائی رہتی ہے اور ٹڈیوں کے بولنے،مینڈکوں کے ٹرانے اور سانپوں کے شوکنے کی آوازیں بھی سنائی نہیں دیتیں تو اُسے لگتا ہے کہ وہ بھی مر چکا ہے اور کسی کچی، ٹوٹی ہوئی قبر میں بے حس وحرکت پڑا ہے۔ لیکن کبھی کبھی چاندنی راتوں میں گھنگھروؤں کی جھنکار سن کر اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔۔۔اور قبرستان کے عین

وسط میں الاؤ کے گردبے کفن جوان عورتیں محوِ رقص ہوتی ہیں۔ ہوا کے جھونکے درختوں کی ٹہنیوں سے ٹکرا کر تال دیتے ہیں اور اپنی اپنی قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تماشائی مردے تالیاں بجا بجا کر داد دیتے ہیں اور وہ میلے بدن سے کھجلاتا، کڑوے تمباکوکے گہرے کش لیتا اور رات رات بھر جھومتا رہتا ہے۔''(۵)

منشا یاد نے کچی اور پکی قبر سے معاشرے کے امیر اور غریب طبقے کو تشبیہ دی ہے۔ طبقاتی تقسیم سے معاشرے زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوڈو فقیر اس تقسیم کو ختم کرنے کی طاقت تو نہیں رکھتا لیکن رات کے اندھیرے میں خواب کے ذریعے وہ اس تفریق کو ختم کرتا ہے اور قبرستان کے عین وسط میں الاؤ کے گرد بے کفن جوان عورتوں کو محوِ رقص دیکھ کر اپنی جنسی پیاس بجھاتا ہے۔ اس افسانے میں معاشرے مین طبقاتی تقسیم کی انتہائی صورت دکھائی گئی ہے جس سے جبر اور محرومی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

''افسانہ ''اوور ٹائم'' میں نمودونمائش اور خوشامد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک کلرک ہے جو اپنے ایک افسر کی والدہ کی وفات پر اپنے افسر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تدفین ورتکفین میں بڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے افسر کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ وہاں اعلٰی افسران موجود ہیں اور ان میں صرف وہی معمولی کلرک ہے۔ '' بہت سے لوگ نمازِ جنازہ پڑھ کر رخصت ہو گئے تھے اس کا خیال تھا اب تھوڑےلوگوں میں وہ اسے ضرور دیکھ لیں گے اور یاد بھی رکھ سکیں گے لیکن وہ دوسری جانب کندھا دے کر پیچھے ہٹ گئے اور سر جھکا کر جنازے کے پیچھے چلنے لگے۔۔۔ لیکن ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد بھی انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی تواس کا دل بیٹھنے لگا۔'' (۶)

افسانہ نگار نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ موقع چاہے سوگ کا ہو یا خوشی کا دولت کو ہی بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ صاحبِ حیثیت شخص کی سب ہی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں انسانیت کے جذبات بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

''باگھ بگھیلی رات'' افسانہ میں جاگیردارانہ نظام کے جبر کے خلاف احتجاج ہے۔ افسانہ نگار جاگیرداری معاشرے کی خرابیاں بتدریج سامنے لاتا ہے۔ اس نظام میں غریبوں کو سچ بولنے کا اختیار حاصل نہیں۔ افسانے میں گاؤں کا چودھری اپنے دشمنوں کی بھیڑ ذبح کر دیتا ہے۔ اور ایک لڑکی کا باپ عدالت میں سچ بولتا ہے لیکن سچ کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا ہے۔

'' وہ خود بھی حیران تھا کہ کب اور کیسے اس نے سچ کے زہر کا پیالہ منہ سے لگا لیا۔باہر آکر اس نے ان سے معافی مانگنا چاہی مگر انھوں نے بھیڑیوں جیسے منہ پھاڑ کرکہا۔ تمہارے گھر میں بھی بھیڑ ہے۔ اب دیکھتے ہیں تم اسے کیسے بچاتے ہو۔''(۷)

اس افسانے میں حقارت کا ایک طوفان ہے جو جاگیرداری معاشرے میں ہر طرف نمایاں نظر آتا ہے۔ منشا یاد کے افسانوں کا سب سے اہم موجوع بھوک اور افلاس ہے اور یہ معاشرے میں پائے جانے والی معاشرتی وسماجی ناہمواریوں، مسائل اور نفسیاتی کشمکش کو اُجاگر کرتا ہے۔

منشا یاد نے اپنے افسانوں میں ایسے کرداروں کو پیش کیا جن کا بنیادی مسئلہ بھوک اور افلاس ہے۔ زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم یہ کردارمعاشرتی بے راہ روی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں افسانہ ''ماس اور مٹی'' اہمیت کا حامل ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار 'ناتوسانسی' گاؤں کا رہنے والا ہے جو چوری اور سینہ زوری کے ذریعے اپنی روزی تلاش کرتا ہے۔ افسانے میں انسان کی کبھی نہ ختم ہونے والی بھوک کو 'ناتو سانسی' کے کردار کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ صدیوں سے بھوکا ہے اس کی ماں عالمے اور بہن مادوگاؤں سے بھیک مانگ کر گزارا کرتی ہیں۔ اس کا باپ دارو پی کر گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر حقا پیتا اور گدھوں کی پرواز کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اسے کسی مردار کا پتا چلتا ہے تو بہت سارا گوشت کاٹ کر لے آتا اور انگاروں پر بھون بھون کر کھاتا۔ لیکن ناتو کو مردار اچھا نہیں لگتا۔ وہ لوگوں کی مرغیاں اور بھیڑ بکریاں چُرا کر لے آتا اور ان کو مار کر کھاتا۔ چوری کے الزام میں کئی بار پکڑا گیا مگر باز نہ آیا۔ ناتو سانسی کی بھوک اس قدر زیادہ ہے کہ وہ کئی

آدمیوں کا کھانا کھا جاتاہے۔ منشا یاد نےاس کہانی کے ذریعے انسان کے اندرکے لالچ اورحرص کو نمایاں کیا ہے جو غربت میں کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔
اس حوالے سے منشا یاد لکھتے ہیں:

’’ یہ محض بھکاری نہیں ہوتے بلکہ ان کا تعلق شودروں کے اُن خاندانوں سے ہے جن کومعاشرے سے گندی مکھی کی طرح باہر نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ جو کبھی شاید اس سرزمین کے باشندے تھے۔ وہ انسانوں سے الگ حیوانوں سے بدتر زندگی گزارنے پرمجبور کر دیے گئے۔ مردار کھانے اور غیر فطری زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ طرح طرح کے ذہنی وجسمانی امراض اور خامیوں کا شکار رہتے ہیں کہ دیکھ کرروںگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ’کوڑھ‘ ان میں عام ہے دیہات سے کچھ دور گندےجوہڑوں کے کنارے ان کے اِکا دُکا جھونپڑے نما مکان ہوتے ہیں۔ ان کو گگڑے، سانس، چمکار، چوہڑے وغیرہ کہتے ہیں۔‘‘(۸)

اخلاقیات سے عاری یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو باپ بیٹی یا بہن بھائی کے رشتے کو بھی اہمیت نہیں دیتے۔ یہ حیوانوں سے بھی بدتر زندگی گزارتے ہیں۔ حالانکہ قدرت نے انسان اور حیوان میں ایک حدِ فاصل رکھی ہے۔ ناتو سانسی بھی ایک ایسا حیوان ہے کہ جس کے اندر کی بھوک بے لگام ہے اور وہ اپنی تسکین کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ حلال حرام کے چکر میں نہیں پڑتا۔ اسی لیے وہ اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے اپنی بہن مادو کو ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ لیکن قدرت اس کے منہ پر طمانچہ مارتی ہے کہ بہن عورت نہیں بلکہ تیسری جنس سے تعلق رکھنے والی بدنصیب ہے۔ جسے عرفِ عام میں ہیجڑے کہا جاتا ہے۔ باپ بیٹے کی شکست پر اس کا مذاق اُڑاتا ہے اور بیٹا اپنی ناکامی پر کھسیانا ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہانی بغاوت اور معاشرے کی ناانصافی کا تاثر پیش کرتی ہے۔ جو جہالت اور کسمپرسی ہیں ڈوبا ہوا ہے۔

’’بانجھ ہوا میں سانس‘‘ ماحولیاتی آلودگی کے تناظر میں لکھی جانے والی کہانی ہے۔ یہ آج کے ترقی یافتہ معاشرے کی روداد ہے۔ جہاں ملاوٹ کا ناسور انسانی زندگی میں سرایت کیے ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے جبر اور ظالم قوتوں کے ظلم کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی بااثر لوگ ہوسِ زر میں انسانیت کے درجے سے گر جاتے ہیں۔ اور مفلوک الحال غریب عوام سے آکسیجن تک چھین لیتے ہیں۔ یہ کہانی اپنے اندر کثیر معنی پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ’فتے‘ ہے۔ جو ایک رات سویا ہوا ہوتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔

’’اچانک اسے یاد آتا ہے جس کے بارے میں وہ کئی دنوں سے مختلف افواہیں سُن رہا تھاکہتے تھے نئے مہینے کی پہلی تاریخ سے ہوا بدل جائے گی اور اس میں جانداروں کوسانس لینا دشوار ہو جائے گا---- چودھریوں کے ہاں ہوا سے بھرے ہوئے بالکل ویسے ہی سلنڈر دیکھے تھے جیسے ہسپتالوں میں ہوتے ہیں۔ ان میں سانس لینے کےلیے نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اسے یاد پڑتا ہے شاید اس ہوا کو آکسیجن کہتے ہیں۔‘‘ (۹)

افسانے میں یہ بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ غریب طبقہ ازل سے جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور امراء کے ہاتھوں پستا رہا ہے۔ ’فتے‘ جانتا ہے کہ ہوا کے بغیر زندہ رہنا محال ہے۔ وہ فاقے کر کے زندہ رہ سکتے تھے مگر ہوا کے بغیر رہنا نا ممکن تھا۔ اس لیے وہ چھوٹے ملک کے پاس ہوا مانگنے جاتا ہے مگر چھوٹا ملک فتے سے اس کی بیٹی کی عصمت کا سودا کرتا ہے۔

’’مجھے منظور ہے ملک جی----آپ جلدی کیجیے--- خدا کے لیے، چھوٹا ملک اسے گن کر تین سلنڈر دیتا ہے--- سلنڈر کی گیس سونگھتے ہی اسکی بیوی اور بیٹا ہوش میں آجاتے ہیں۔ ساتھ والی چارپائی پر چھوٹا ملک داری کو ہوش میں لاتا ہے۔ اور---- ‘‘ (۱۰)

’’اندھیرے سے اندھیرے تک‘‘میں افسانہ نگار نے واضح کیا ہے کہ بُرائی کا بدلہ بُرائی ہی ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات وضح کی گئی ہے کہ دولت کی بہتات لوگوں کو اتنا آسودہ حال کر دیتی ہے کہ اُن کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں رہتا۔ خریداری کے لیے روپے پیسے کی بہتات ہے۔ چنانچہ اُن کے لیے ایمان، اصول، اخلاق، شرافت، شرم وحیا، عصمت اور غیرت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ جبکہ شکست خوردہ

افراد کی نفسیات یوں بنی:

'' بکنے والے دکانوں کے خالی تھڑوں پہ آکر بیٹھ جاتے اور پیٹ بھرنے کے لیے گاہکوں کے ہر حکم کی تعمیل کرتے اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ خریدار من مانی شرائط پرنت نئی خواہشیں پوری کرتے اور نئے نئے تجربات سے زندگی کے جمود کو توڑنے کی کوشش کرتے۔'' (۱۱)

امیر اور غریب کی نفسیات اور رویوں میں بھی واضح فرق دکھاتے ہیں۔ یوں منشا یادقانون ساز اپنے مفاد کی خاطر نت نئے قوانین بناتے۔ اور دولت مند طبقہ انھیں خرید کر اپنی حفاظت میں سرگرم رہتا ہے۔ اُن کی نظر میں قانون بے معنی جبکہ قوانین کا شکنجہ مظلوم کو جکڑتا ہے۔ لاقانونیت کے مزے دولت مند یا برسرِ اقتدار طبقے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ جبکہ قوانین صرف عوام کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ انھیں پابند کرسکیں اور اپنے مفاد کی قربان گاہ پر چڑھایا جا سکے۔ عافیت اسی میں ہے کہ وہ حالات سے سمجھوتہ کریں یا پھر آبادیوں سے ہٹ کر گوشہ نشین ہو جائیں۔ جب ظلم وجبر حد سے بڑھ جائے تو قہر خداوندی بے لگام لوگوں کا محاسبہ کرتا ہے اور وہ قدرت کے اس اٹل قانون کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ منشا یاد ایک سنجیدہ افسانہ نگار ہے اس لیے چپ چاپ اپنا مقصد بیان کرتا رہتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

'' محمد منشا یاد اس دور کے دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں مجھے اس وجہ سے مختلف اور خوشگوار حد تک مختلف لگتا ہے کہ وہ بڑبولا نہیں ہے۔ وہ اپنے لب کی سرگوشی کو نشر کرنے کے لیے لاؤڈ سپیکراستعمال نہیں کرتا۔ وہ افسانہ لکھتے ہوئے بھی اور چھپوا کر بھی اور سب افسانوں کو کتابی ِصورت میں مرتب کرکے بھی چپکا رہتا ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ سننے والے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ مگر سرگوشی آفاق میں پھیلی ہوئی گونج بن جاتی ہے۔ جسے سننا بھی چاہیں تو سنائی دے جاتی ہے۔ منشا یاد کی کہانیاں یہی سرگوشیاں ہیں۔'' (۱۲)

دوسروں کا کرب، دکھ اور احساس منشا یاد کے احساس میں ڈھل کر کہانیوں کو جنم دیتا رہا۔ ان کی بیشتر کہانیوں کا موضوع فرد کی داخلی کشمکش، بے چارگی، خوف تنہائی، جبر، ظلم اور نااُمیدی ہے۔ جس سے ناصرف معاشرے کے محروم افراد کی تصویر کشی ہوتی ہے بلکہ معاشرے میں موجود معاشرتی وسماجی مسائل کی تہ در تہ عکاسی ہوتی ہے۔

''بوکا'' اور ''تماشا'' دو بڑے افسانے سیاسی اور سماجی پسِ منظر میں لکھے گئے۔ ''بوکا'' میں لوگوں کی پیاس اور کنویں سے پانی کا خشک ہو جانا سماجی رویے کا عکاس ہے۔ جبکہ ''تماشا'' لوگوں کو تفریح طبع فراہم کرنے والے ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو لوگوں کو تماشا دکھاتے دکھاتے خود تماشا بن گیا۔ کیونکہ مداری کے ہاتھ سے انجانے میں خود اس کے بیٹے جمورے کا ذبح ہو جانا فرد کے اندر موجود الجھنوں، واہموں اور آسیب کی کہانیاں ہیں۔ مداری گمان یہ کرتا ہے کہ چادر کے نیچے لیٹا ہوا جمورا چھری کی زد سے دور ہو گیا ہے وہ چھری تھیلے سے نکال کراس کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے:

'' صاحبان---قدردان---- کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چھری نہیں چلا سکتا۔نہ ہی اللہ کے پیغمبروں کے سوا کسی میں اتنی ہمت اورحوصلہ ہو سکتا ہے--- یہ سب کچھ ایک کھیل ہے۔ نظر کا دھوکہ --- اس پاپی پیٹ کی خاطر --- چھری چلاؤ--- چھری چلاو تماشائی شور مچاتے ہیں۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور جمورے کے قریب آکر چھری چلاتا ہے---''(۱۳)

منشا یاد نے افسانے میں اس معاشرتی بے حسی کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے آج سماج کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ''تماشا'' کے حوالے سے مظفر علی سید لکھتے ہیں:

''تماشا کا شمار پریم چند کے 'کفن' منٹو کے 'بابو گوپی ناتھ'، 'ہتک اور بو' اوربیدی کے 'گرہن' اور 'الٰہ آ باد کے حجام' کے شانہ بشانہ نہیں تو ان کے فوراََ بعد ضرور کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایسے افسانوں کی ذیل میں جن کی نت نئی تفسیریں ہو سکتی ہیں اور کوئی حتمی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔'' (۱۴)

منشا یاد نے اپنے افسانوں میں سیاسی ومعاشرتی جبر کے خلاف بھرپور احتجاج کرتے ہوئے ظلم کی روداد کو افسانہ ''دھوپ، دھوپ، دھوپ'' میں بیان کیا ہے۔ افسانے کا مرکزی خیال جبر کے خلاف احتجاج ہے اور دھوپ کو ظلم وجبر کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ منشا یاد نے اپنے افسانوں میں کسانوں اور نچلے متوسط طبقوں میں پائی جانے والی سیاسی و سماجی گھٹن کی فضاؤں اور دیہی زندگی کی مفلوج صورتِ حال کی عکاسی اپنے مخصوص اسلوب سے کی ہے۔ کیونکہ دیہات میں زندگی بسر کرنے والے وہ غریب مزارعے، کسان یا کمی کمین جو چودھریوں اور جاگیرداروں کے ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔ اپنے حقوق کی خاطر آواز تک نہیں بلند کر سکتے۔

''دیوار گریہ'' رسم ورواج کے بھینٹ چڑھ جانے والی ایک ایسی عورت (خالہ) کی کہانی ہے جو نیچ ذات کے ایک شخص اکبر ماچھی سے محبت کرتی ہے۔ پنچائیت اس شادی پر راضی نہیں ہوئی نتیجتاً خالہ کسی دوسرے شخص سے شادی نہیں کرتی اور ساری عمر کنواری رہتی ہے۔ جبکہ اکبرے سے ملاقاتیں جاری اور رشتہ الفت نبھاتی رہتی ہے۔ افسانے میں ان سماجی مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے کہ معاشرتی تفاوت اور نام نہاد رسموں کی رکھوالی کرنے والے نام نہاد اخلاقیات کا جنازہ اُٹھتے نہیں دیکھنا چاہتے اور اصل حقیقت سے آنکھیں موند لیتے ہیں۔ یوں معاشرتی ناہمواری ذات پات کی تقسیم سماج میں آگے بڑھتی ہے۔ معاشرے کے ٹھیکیدار فیصلہ کرتے وقت اصل انسانیت کے تقاضوں کو بھول جاتے ہیں اور غلط رسم ورواج معاشرے کو کھوکھلا کیے رکھتے ہیں۔

منشا یاد کی نظریں ماحول کا بغور گہرا مشاہدہ کرتی ہیں۔ وہ غریب مزارعے کسان یا کمی کمین کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں جو چودھریوں اور وڈیروں کے ظلم کا نشانہ بنتے ہیں۔ ظلم و جبر جو نسلوں سے اُن میں راسخ چلا آرہا تھا اب حالات کا ادراک ان مظلوموں کو ہونے لگا۔ لیکن حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی ہمت اب بھی ان میں نہیں۔ ''آدم بو'' ایسے ہی حالات کی نشاندہی میں لکھا گیا افسانہ ہے جس کا مولوی اللہ رکھا کا کردار غریب اور مفلسی کا شکار ہے۔ جو زیادہ دیر تک اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھ سکا۔ ضروریات اس کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے ضمیر کی آواز دبانے پر مجبور۔ ناجائز کو جائز بنانے پر دل گرفتہ ہو کر بھی اپنی آواز بلند نہیں کر پاتا۔ اس طرح معاشرتی رویوں میں پایا جانے والا دہرا تضاد کھل کر سامنے آتا ہے۔

منشا یاد کا یہ فنی کمال ہے کہ وہ انسان کے اندر چھپی ہوئی فطری خواہشات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جسے پڑھ کر انسان کی حقیقی اور فطری تصویر ہمارے ذہن پر اُبھر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ منشا یاد، ''بند مٹھی میں جگنو''، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص۱۱۹
۲۔ ایضا، ص۹۵
۳۔ ایضاً، ص ۱۳۱
۴۔ ایضاً، ص ۷۹
۵۔ منشا یاد، ''ماس اور مٹی''، مثال پبلشرز، فیصل آباد، طبع دوم، ۲۰۱ء، ص ۲۴
۶۔ ایضاً، ص ۷۹
۷۔ ایضاً، ص۳۲
۸۔ ارشد خانم، ڈاکٹر، 'منشا یاد (ایک عظیم افسانہ نگار)''، ادارہ فروغ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲، ص۳۲
۹۔ منشا یاد، ''ماس اور مٹی''، مثال پبلشرز، فیصل آباد، طبع دوم، ۲۰۱ء، ص ۹۲
۱۰۔ ایضاً، ص ۹۵
۱۱۔ ایضاً، ص۹۹
۱۲۔ منشا یاد، ''بند مٹھی میں جگنو''، مشمولہ ماہنامہ، سپوتنک، لاہور، مدیر اعلیٰ، آغا امیر حسین، جلد نمبر ۱۹، شمارہ ۸، جولائی ۲۰۰۸، ص ۳۷
۱۳۔ منشا یاد، ''خلا اندر خلا''، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۹
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸